# ایک بےعنوان تحریر

شمیم حنفی


## Abstract

This essay raises question as to why long time frame distance has been accepted as essential precondition for quantification of urdu literature's standard. contemporary research and Litarary Landscape should be vide enough so as to quantify contemporary literary trends and value.


ہمارے یہاں چیزوں اور واقعات کو پرانا کر کے دیکھنے کی روش بہت عام ہے. یہ ایک مہلک رجحان ہے. ایک طرح کی بدبختی بھی ہے. اسی لیے تو وقت آگے کھسکتا جاتا ہے ہم خاموش اور ساکت بیٹھے رہتے ہیں پھر آج کی واردات جب ہماری یاداشت کا حصہ بن جاتی ہے تو ہمیں ہوش آتا ہے. کبھی کبھی نہیں بھی آتا. ماضی پرستی اور قدامت پسندی ایک خطرناک میلان ہے. ہمارے جذبوں اور احساسات کو اپاہج کر دینے والا اس کا خمیازہ ہمارے ساتھ ساتھ ہمارے عہد کی تاریخ کو بھی بھگتنا پڑتا ہے بورخیس کے ایک لازوال کھیل میں ایک کردار کہتا ہے.

''اداس لوگو! تمھارے بھائی کی پٹائی ہو رہی ہے اور تم نے آنکھیں بند کر لی ہیں اس کی ٹھکائی ہوئی
اسے مارا گیا اور تم چپ ہو۔۔۔ یہ کیسا عجیب شہر ہے اور تم کتنے عجیب لوگ ہو؟''

تو کیا واقعی یہ خطاب ہم سے نہیں جہاں گزاراں کے کسی اور زمانے کے باشندوں سے ہے۔اسی تمثیل کا ایک اور اقتباس ہے شاید یہ مسئلہ واضح ہو جائے سنیے!

''جب وہاں ناانصافی ہو رہی ہو۔۔۔تو شہر میں بغاوت اٹھ کھڑی ہونی چاہیے اور اگر ہنگامہ نہیں
کھڑا ہوتا تو بہتر ہوگا کہ رات کے ڈھلنے سے پہلے یہ شہر جل کر راکھ بن جائے''

بیشک ہر قوم کا سرمایہ افتخار اس کے کلاسیک ہوتے ہیں اور یہ سچائی بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ ماضی صرف ماضی نہیں ہوتا. مگر ہمیں اپنے ہونے کی گواہی تو اپنے حال سے ملتی ہے. ہمیں آج کا اخبار اگلے روز، اگلے ہفتے، یا اگلے مہینے یا اگلے سال پڑھنے کی بیمار عادت سے بچنا چاہیے. پرستش لمحہ موجود کی ہو یا گزشتہ زمانے کی دونوں الگ الگ طریقے سے ہمیں نقصان پہنچاتی ہیں مگر ماضی، روایت، تاریخ کو اپنے لیے پنجرہ بنا لینا تو صحت اور عقل دونوں کے خلاف ہیں.

بدقسمتی سے تعلیم کے اعلیٰ اداروں اور مراکز میں ہم زبان و ادب کے معاملے میں ہلاکت خیز اور خلافِ

عقل رویے کے عادی اور اسیر ہیں. ادب کے نام پر ادب کی تاریخ پڑھتے ہیں اور اکثر ایسے مسئلوں کو سمجھنے اور حل کرنے میں اپنی جان کھپاتے ہیں جو ہم سے زیادہ ہمارے رفتگاں کے مسئلے تھے اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں گھورتی ہوئی ساعتیں، ان کے اپنے وقت سے مناسبت رکھتی تھیں۔ وقت بھی ندی کی لہروں جیسا رواں دواں ہے. ہم ایک ہی ندی میں دو بار نہیں نہا سکتے. زندگی ایک ہی وقت میں دو بار نہیں گزرتی. بہت کچھ مشترک ہونے کے باوجود ہر دور اپنے پہلے اور بعد کے دور سے مختلف ہوتا ہے. زندگی ایک مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک نیا مسئلہ آن کھڑا ہوتا ہے. ہم لاکھ جتن کریں فیض، راشد اور میراجی کو امام بخش ناسخ نہیں بنا سکتے.

منشی پریم چند نے جینیدر کمار کے نام ایک خط میں لکھا تھا.

کہانی دل کی آواز ہے بیانیہ کے ضابطوں کی پیداوار نہیں. ناول اور شاعری کو ناول اور شاعری کے فن کی شرطوں اور اصولوں سے الگ کر کے بھی دیکھنا چاہیے شعری اظہار اور بیانیہ کی حکمت عملی جیسے مباحث صرف کلاس روم کی بے روح فضا کو راس آتے ہیں. ہم منشی پریم چند اور مرزا اطہر بیگ یا اکرام اللہ کو بھی ایک سطح پر رکھ کر نہیں سمجھ سکتے. ہمارا دور بحر الفصاحت اور فن افسانہ نگاری کا دور نہیں ہے.

پھر ہم کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں اور اپنی بقا کے لیے ہمیں کونسا راستہ اختیار کرنا ہوگا؟ وہ وقت جس کا سرا ہمارے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے ہمارے لیے آج کتنا با معنی ہے؟ ماضی، تاریخ اور روایت کے مفسروں کو بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں. کئی خانوں کو بھرنا، بہت سی جھریوں کو دور کرنا، گئے تجربوں کو ہم عصریت کا چہرہ دینے کے لیے بہت سا میک اپ کرنا پڑتا ہے.

بقول شخصے (شیام لال) ہر عہد کے اپنے تناؤ، تماشے اور الجھاوے ہوتے ہیں. تجدد پرستی کا پورا دور اخلاقی سراسیمگی کے ساتھ ساتھ شدید ذہنی تناؤ کا دور تھا. انسانی تاریخ کے کسی دور میں نظریاتی تنازعوں کی ایسی کثرت، اتنی آپا دھاپی دکھائی نہیں دیتی. ہر دور کی طرح وہ دور بھی گزر گیا. مگر زندگی تو اب بھی مشکل میں ہے اور دباؤ میں ہے. مذہب، ما بعد الطبیعات، تعقل اور سائنسی شعور، روایت، حقیقت پسندی، مارکسزم اور نہ جانے کتنے اسم (ISM) آزمائے جا چکے ہیں. مگر کچھ خانے ہمیشہ خالی رہ جاتے ہیں. نہ تو مرحلہ شوق طے ہوتا ہے نہ تاریخ کبھی خود کفیل ہوتی ہے.

لہٰذا کئی سوال ہیں اور سارے سوال غلط نہیں. اس لیے تو جواب تلاش کرنا ہی ہوگا. تعقل میں نہیں تو جذبوں کی زمین پر. ہمارے اس نکمے اور ناداں زمانے کو اصل میں سامنا ہی سوال کا ہے اور اس کا راستہ انسان دوستی کے نئے شعور سے ہو کر جاتا ہے. کسی ایک روایت کا یا دنیا کے کسی ایک علاقے کی زنبیل میں اکیسویں صدی کے مسئلوں کا حل نہیں ہے. ضرورت ہے انسان دوستی کے نئے اقدار کی سطح پر مختلف قوموں، علاقوں اور گروہوں کے مابین ٹھنڈے مکالمے کی ہے جس کے لیے (نام و یوڈھ سال کے لفظوں میں) چاروں طرف بے محابا شعور کے باعث گنجائش زیادہ نہیں ہے. تاہم تخلیقی زبان یا ادب اور آرٹ کی زبان انتشار میں ترتیب اور پاگل پن کے ماحول میں

ایک نیا نظم وضبط پیدا کرتی ہے اور ایک نئی حوصلہ مندی کا پتہ دیتی ہے چنانچہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نظریاتی ناخواندگی کے دور کے ساتھ زندگی اور زندگی کی امید ختم تو نہیں ہوگئی. اپنی فکر کو ڈی کولونائز کرنے کا مطلب جدید افکار سے انکار نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی اس اُلجھن کو سلجھانے کی خاطر ہمیں گرد و پیش کی دنیا پر بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے. تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں اس لیے نثر کی بجائے اب میں نظم کا سہارا لیتا ہوں (افضال احمد سید) کی ایک نظم "ہمیں بہت سارے پھول چاہئیں" کے اس اقتباس پر اپنے معروضات ختم کرتا ہوں.

ہمیں بہت سارے پھول چاہئیں
اُن زخمیوں کے لیے
جو ہسپتالوں میں پڑے ہیں
جہاں جاپانی یا کسی اور طرح کے راک گارڈنز نہیں ہیں
ہمیں بہت سارے پھول چاہئیں
کیونکہ ان میں سے آدھے مر جائیں گے
ہمیں رات کو کھلنے والے پھولوں کا اک جنگل چاہیے
اُن لوگوں کے لیے
جو فائرنگ کی وجہ سے سو نہیں سکے
ہمیں بہت سارے پھول چاہئیں
بہت سارے افسردہ لوگوں کے لیے
ہمیں بہت سارے پھول چاہئیں
بہت ساری رقص کرتی بیلوں پہ لگے
جن سے ہم اس پورے شہر کو چھپانے کی کوشش کر سکیں

☆☆☆